

تہذیبِ مغرب کی مَرمریں سلیں

جناب منیر احمد خلیلی صاحب

تہذیب اور کچر بہت موٹی موٹی مقبوری اور ادق نظریات اور پیچیدہ افکار سے نہیں تشکیل پاتے۔ ان کا غیر معاشرے کے افراد کے چھوٹے بڑے اعمال و افعال، رویوں اور معمولات و عادات سے اُٹھتا ہے۔ کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، ملنا جلنا، اُٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، یہ سب اس میں شامل ہوتا ہے۔ حرکات و سکنات اس کا جزو بنتی ہیں۔ سفر و حضر اس کی گرفت میں آتا ہے۔ جلوت ہی نہیں خلوت بھی اس کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اندازِ نشست و برخاست پر اس کی چھاپ ہوتی ہے۔ تہذیب ان سب کی مٹی گوندھ کر بنتی ہے۔ البتہ ایک چیز تہذیبی تشکیل میں بنیادی اور اہم ترین عنصر کے طور پر کار فرما ہوتی ہے۔ وہ ہیں کسی معاشرے کے مخصوص عقائد اور ایمانی تصورات۔ تمام تہذیبی اجزاء کے معانی و مفہام ان اعتقادی اور ایمانی تصورات کے تابع ہوتے ہیں۔ تہذیب کے اجزاء اُنے ترکیبی کی اہمیت میں کمی بیشی کا پیمانہ ہی عقائد و تصورات بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے وقت ایک غیر مسلم کے ذہن میں محض یہ تصور ہوتا ہے کہ ہاتھوں کی آلودگی میں مہلک اور ضرر رسانی جراثیم شامل ہو سکتے ہیں اور ہاتھ دھو کر بغیر کھانے سے وہ جراثیم معدے میں چلے جائیں گے اور کھانا کھانے والا بیمار پڑ سکنا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک خدا پرست مسلمان کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی اس لیے فکر کرے گا کیونکہ یہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ہے۔ لامحدہ دھونے سے صفائی اور حرا ئیم سے نجات کا مقصد تو حل ہو ہی جائے گا۔
 اتبارِ سنت سے خوشنودی رب کا حصول بھی ممکن ہو جائے گا۔ یہاں مُسلم اور غیر مُسلم
 کے ایک ہی عمل میں غایت کے مرکزی نکتے میں بنیادی فرق سامنے آ گیا ہے۔ یہی فرق
 دونوں کی تہذیبوں میں بھی ما بہ الامتیاز کا درجہ پائے گا۔ ایک غیر مُسلم کسی سے ملتے
 وقت صبح یا شب بخیر یا نہستے یا نہسکار کہہ کر ملے گا تو مقصد یہ ہو گا کہ اُس کی ملتساری
 خوش اخلاقی اور تواضع کا ثبوت بہم پہنچ جائے، لیکن ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی
 کو جب سلام کرتا ہے تو اس چھوٹے لیکن بڑے ہی خوب صورت جملے کی کُشت پر
 حصولِ جنت کی طلب اور ایمان کی تکمیل ہونی لازمی ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے نبی
 صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت ہے کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک صاحبِ ایمان نہ بن
 جاؤ۔ اور تم مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ تم باہم محبت نہ کرو۔ اور کیا میں تمہیں ایک
 ایسی بات نہ بتاؤں جس پر عمل کرو تو تم میں باہمی محبت پیدا ہو جائے۔ وہ عمل یہ
 ہے کہ آپس میں سلام کو عام کرو۔ (مُسلم) باہم میل جول، محبت بھرا تعلق اور حسنِ معاملہ
 معاشرتی ضرورتوں میں سے ہے۔ کوئی معاشرہ ان اعمال اور رویوں سے خالی نہیں۔
 لیکن وہاں تعلق داری اور محبت و نفرت کا معیار ذاتی اغراض و مفادات ہوتے ہیں
 کہ بھلا ہو بھلا کا فلسفہ کار فرما ہوتا ہے۔ مسلمان معاشرے میں کسی سے بھلائی کرنے اور
 قریبی اور پر محبت تعلق رکھنے کی پشت پر اگر للہیت کی روح نہ ہو تو ان اعمال، رویوں
 اور تعلقات کی اہمیت خاک میں مل جاتی ہے۔ مُسلم معاشرے میں روابط و تعلقات کی
 اساس یہ ارشادِ نبوی بنتا ہے۔

اَلْمَوَالَاةُ فِي اللّٰهِ وَ الْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَ الْبُغْضُ فِي اللّٰهِ

یعنی اللہ کے لیے دوستی، اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت۔

عطا و نوازش سے کوئی معاشرہ عاری نہیں۔ ضرورت مند عزیزوں، یتیموں اور یتیموں
 کے لیے ایشا رکھا جاتا ہے، لیکن کسی کو نوازتے وقت کہیں اپنی حاتم صفت شخصیت متوانا

مطلوب ہوتا ہے، کہیں ووٹ لینے اور کسی نوع کے تعاون کی جستجو کا رفرما ہوتی ہے۔ کہیں انکم ٹیکس سے چھوٹ کے لیے خیرات کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، کہیں تمغہ خدمت کا حصول مقصود ہوتا ہے، لیکن اسلام نے اس عطاء و نوازش کو تکمیل ایمان کا ذریعہ اور رب کو راضی کرنے کا راستہ بنا دیا۔ جو شخص اللہ کے لیے دے اور اللہ ہی کے حکم اور منشا کے مطابق دے وہ گویا اپنا ایمان مکمل کر لیتا ہے۔ (ابوداؤد)

ان ساری مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی تہذیب میں اعمال اور روٹیوں کی ایجابی و سلبی قدر و قیمت کا تعین دوسری بے خدا تہذیبوں کے مقابلے میں یکسر جدا نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے۔ یہاں حقیر سے حقیر عمل بڑے بڑے مثبت یا منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ نہ تو کسی نیکی کو حقیر جانو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو، نہ ہی کسی بُرائی کو معمولی سمجھو خواہ درجے میں وہ صفائے فہرست میں سب سے نیچے ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (زلزال - ۱۸)

یعنی ذرہ برابر نیکی اور ذرہ برابر بدی یوم حساب نظر انداز نہیں رہے گی، سب انسان کے سامنے آجائے گی۔ یہاں تک کہ بعض اعمال انسان سے سرزد ہوتے ہیں تو وہ اس کی نظر میں اتنی اہمیت کے قابل بھی نہیں ہوتے کہ اگلے لمحے تک انہیں ذہن میں رکھتے۔ قیامت کے روز وہ اپنے حساب میں یہ باریک شماری دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اُس کے نامہ اعمال میں ایسی نیکیاں اور ایسے گناہ محفوظ ہیں جنہیں خود اُس نے دنیا میں پرکھا اہمیت نہیں دی تھی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی بنا پر اپنے اعمال پر خود کڑے محاسب اور تشریف دار و غہ کی مانند خوردہ گیر رہتے تھے۔ یوم حساب کے ڈر سے اپنے اعمال کا خود حساب کتاب کرتے رہتے تھے۔ اور اپنے نمبر لگاتے وقت انتہائی سخت ممتحن کا

انداز اختیار کرتے تھے۔ ہم آج جن باتوں اور حرکتوں کو معمولی جان کر بے دھڑک زبان اور ہاتھ پاؤں سے صادر کر دیتے ہیں۔ وہ اس طرح کی باتوں کو زبان سے نکالنے اور ایسے رویتے کے تصور سے کانپ اٹھتے تھے، چنانچہ حضرت انسؓ بتاتے ہیں اور یہ بخاری کی روایت ہے:

”تم لوگ بہت سے اعمال ایسے کرتے ہو کہ تمہارے نزدیک وہ بال سے بھی زیادہ باریک اور ہلکے ہیں، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہریوں ان کو مہلکات (تباہ کر دینے والے اعمال) میں شمار کرتے تھے۔“

آئندہ سطور میں ہم چند ایسی چیزوں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں جو بظاہر معمولی نظر آتی ہیں۔ ان کے ترک و اختیار کے وقت انسان کے احساس کو کوئی سخت جھٹکا نہیں لگتا۔ بعض کے بارے میں ہلکی سی چٹھن بھی نہیں ہوتی، لیکن ان سب کا ہمارے اعتقادات اور ہماری تہذیبی روایات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جب ایک سنت ہاتھ سے چھوٹی اور عمل سے خارج ہوتی ہے تو اس کی جگہ خالی نہیں رہتی، بلکہ کوئی بدعت اس خلا کو پُر کر دیتی ہے۔ ہم اپنی معاشرت کی پہچان رکھنے والے کسی عمل کو ترک کرتے ہیں تو مغربی یا ہندوانہ تہذیب کی کوئی رسم یا روایت ہمارے تہذیبی تسلسل میں داخل ہو جاتی ہے:

۱۔ دوپٹہ بظاہر دو گز کپڑا ہے، لیکن یہ ہماری تہذیب میں عقیدے کی قوت سے داخل ہو کر عورت کی نسوانیت، وقار، شرف و عزت، شرم و حیا، نیکی و شرافت اور خاندانی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ چہرہ نہیں تو کم از کم سر ہی اچھی طرح ڈھانپ کر رکھنے والی عورت کے بارے میں اولین تاثر اس تاثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو کسی بے حجاب اور رنگے سروالی عورت کو دیکھ کر ابھرتا ہے۔ دوپٹہ کھوجائے تو نسوانیت گم ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک ایسی اینٹ ہے جو دیگر بہت سی اینٹوں کے لیے سہارا بنتی ہے۔ یہ اپنی جگہ سے کھسک جائے تو آہستہ آہستہ وہ ساری اینٹیں بکھرنے لگتی ہیں، جن کے لیے یہ پہلی اینٹ سہارے کا کام دے رہی تھی۔ اولاد کی تربیت، دینی اقدار کا احترام، خوفِ خدا، پاسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، فکرِ آخرت، ازدواجی

ڈھانچے اور خاندانی تعلقات، غرض سب پر اثرات پڑتے ہیں اور ایک کنبہ اور خاندان کی شناخت کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔

۲۔ لیٹرین اور غسل خانہ کی ایک جاتی بظاہر بہت چھوٹی سی بات ہے۔ اس میں کئی فائدے بھی مضمر ہیں۔ سچت اور کفایت کا ذریعہ ہے۔ کم محنت اور کم جگہ میں ضرورت پوری ہو سکتی ہے، لیکن اسلامی کلچر میں غسل خانہ اپنا ایک جدا تصور رکھتا ہے، جس کے ساتھ پاخانے کو جمع نہیں کیا جاسکتا، لیکن آج کل یہ رواج چل نکلا، کہ غسل خانہ اور لیٹرین ایک ہی کمرے میں ساتھ ساتھ بنتے ہیں۔ بہت سے انتہائی دیندار گھرانوں میں بھی اس رواج کو اپنا لیا گیا ہے۔ پھر لیٹرین میں رفع حاجت کے لیے بنی ہوئی مخصوص جگہ کا رخ اگر اس طرح ہو کہ بیٹھتے ہوئے رخ یا بیٹھ کعبہ شریف کی طرف ہو رہی ہو تو اس چھوٹی سی بات کا خیال نہ رکھنے سے نہ معلوم کتنے دینی احساسات مُردہ ہو جاتے ہیں۔ بے حس کی یہ کیفیت اگر گہری ہونے لگے اور بعض بُرائیوں کو معمول سمجھ کر قبول کرنے کی روش چل پڑے تو انسان کا نفس اُسے بڑی بُرائیوں پر ابھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۳۔ مردانہ پتلون بظاہر ایسا لباس ہے جسے آج بڑی حد تک باوقار، شائستہ، پُر رعب اور اعلیٰ اور جدید تعلیم یافتگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہم اس کے غیر اسلامی ہونے پر نہ خود اصرار کرتے ہیں، نہ اس پر کسی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شرقا اور بڑے بڑے سکالر اور صاحبانِ علم بھی پتلون پہن رہے ہیں، تاہم ایک پہلو بہر حال ناقابلِ انکار ہے کہ پتلون کی ساخت اور تراش خراش سے مغرب کے تہذیبی رویوں کا گہرا تعلق ہے۔ وہاں کھڑے کھڑے پیشاب کرنا قطعاً معیوب نہیں ہے۔ پتلون پوش عموماً پیشاب کے دوران میں وہ سہولت نہیں رکھتے جو دھوٹی لنگوٹ یا شلوار پہننے والوں کو میسر ہوتی ہے، چنانچہ پتلون کے کلچر کی مناسبت سے ہر کہیں پتلون پوشوں کے لیے یہ رعایت رکھی جاتی ہے کہ انہیں پیشاب کرنے میں وقت نہ ہو۔ ہوٹلوں، کلبوں، ہوائی اڈوں، بس سٹاپوں، ریلوے اسٹیشنوں، سرکاری دفاتر

میں جو حمام بنے ہوتے ہیں وہاں پتلون پہننے والوں کے لیے دیواروں کے ساتھ ایسے پاٹ لگے ہوتے ہیں جہاں وہ کھڑے کھڑے آسانی سے پیشاب کر سکیں۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں کتنی قباحتیں ہیں یہ شائستگی کے منافی ہے، غیر سنجیدہ حرکت ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ طہارت اور پاکیزگی برقرار رکھنے میں مانع ہے۔ لیکن جو لوگ محض لباس کی مجبوری کے باعث اس قبیح انداز کو اختیار کرتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ اسے عادت بنا لیتے ہیں۔ ایسی عادات تہذیبِ اغیار کا تابع بنا کر انہیں اپنی دینی تعلیمات اور روایات سے کاٹ دیتی ہیں۔

۴۔ فرشی دسترخوانوں کی روایت ٹٹے ٹٹے اب بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ ڈائننگ ٹیبل نے لے لی ہے۔ اب تکلفات بڑھے، دعوتوں میں شرکار کی تعداد اور انداز بدلے۔ مہمانوں کو بٹھا کر کھانا مشکل سے زیادہ جاننا نہ عملی نظر آنے لگا۔ اب دعوتیں خواہ کسی نوعیت کی بھی ہوں ان میں بڑی مضحکہ خیز سی صورت پیدا ہوتی ہے۔ کھڑے ہو کر کھانا مجبوری اور فیشن بن گیا ہے۔ میزبان مہمانوں کی بڑی تعداد کو ترتیب سے بٹھا کر ایک ایک کے آگے پلیٹ رکھنے اور ایک ایک کو کھانا پہنچانے کے جھنجھٹ سے چھوٹ گئے۔ بس ایک جگہ پلیٹیں ڈھیر کر دیں، سٹینڈوں پر رکھی بالٹیوں میں سالن، چاول ڈال دیئے۔ جس کی ہمت ہے جو چاہے جھپٹ کر اٹالے۔ جو بڑھ کر مقام لے لینا اُسی کا ہے، والی بانت۔ ایک رُخ پر روسٹ مرغیاں ادھ چبی لنگی جا رہی ہوتی ہیں اور دوسری طرف کچھ محتاط دست شرفا شرف شرب شور باپی کر ہی اپنے آپ کو کوس رہے ہوتے ہیں۔ "مل کر کھاؤ، اپنے سامنے سے کھاؤ، چبا چبا کر کھاؤ، کھانے میں دوسروں کا خیال رکھو، جو اپنے لیے پسند کرو، وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو، جیسی تعلیمات کی مٹی جتنی ان دعوتوں میں پلیدہ ہوتی ہے، شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔ ان دعوتوں کے مواقع پر آج کل خلاف سنت اطوار مجموعی طور پر بہت زیادہ اختیار کیے جاتے ہیں۔ تکلفات، نمود و نمائش، فیشن زدگی اور دیکھا دیکھی عمل جمع ہو کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں کہ جو لوگ مسنون اور معقول طریقے سے

ان دعوتوں میں کھانے پینے کے خواہش مند ہوتے بھی ہیں وہ مجبوراً اپنی تہذیب اور اپنے دین کی روایات سے متضاد ماحول میں ایسا کر نہیں پاتے۔

۵۔ جلدی سونا اور جلدی جاگنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ صحت کے لیے مفید اور فطرت کے قریب عمل ہے۔ انسان کی طبیعت خوش باش اور قوتِ کار بجا رہتی ہے۔ مزاج خوش گوار رہتا ہے۔ راتوں کو جاگنا اور دیر تک جاگنا کسی دور میں لوفر فنگوں، چور اچکوں، درندوں اور موذی جانوروں کا معمول سمجھا جاتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ مغربی طوراً طوار کا رنگ ہم پر چڑھنے لگا۔ اہل مغرب ہوٹلوں، کلبوں اور شراب خانوں میں دادِ عیش و طرب دینے اور لہو و لعب میں ڈوبے رہنے کے لیے رات کے پہلے پہروں ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ صبح دیر تک سونا ایسے لوگوں کی مجبوری اور بچہ عادت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ٹیلی ویژن کی آمد نے شب بیداری کا سامان پیدا کیا۔ اب بہت کم گھرانے ایسے ہیں جہاں دیر تک جاگنا اور دیر سے جاگنا معمول نہ ہو۔ گویا اس پہلو سے بھی ہم نے فرنگی تہذیب سے مطابقت پیدا کر لی ہے۔

۶۔ کرکٹ کا کھیل ہماری قوم کا جنون اور دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا شوق بن گیا ہے۔ اس وائرس نے پھیل کر قوم کی تمام رگوں میں اپنا زہر پھیل دیا ہے۔ اس پر تفصیل سے اور بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم اختصاراً چند پہلوؤں کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے۔ یہ کھیل بنیادی طور پر تمام کا تمام ہمارے تہذیبی رویوں سے متصادم ہے۔ اس کے اندر وہ مارشل سپرٹ نہیں ہے جو بعض کھیلوں کا خاصا ہے۔ تفسیع اوقات، سہل انکاری، بے فکری، مہنگاپن اس کھیل کی بنیادی خصوصیات میں سے ہیں۔ قوم کو کچھ نہ دے کہ یہ قوم کے اندر سے قوتِ کار، عاقبت و انجام اتالیشی اور محنت و جفاکشی کے جذبے سلب کر رہا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے اس کی مناسبتوں کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ فلمی اداکاراؤں اور کرکٹروں میں کوئی ایسی خفیہ قرینہ مشترک ہے کہ ہمارے بعض کرکٹروں کی شادیاں فلمی ایکٹریسوں سے ہو چکی ہیں۔ کئی ایک کے باہمی ناپسندیدہ روابط کے قلمی اخبارات کی زینت

بننے رہتے ہیں۔ کرکٹ کو آج عمدہ ذوق کی علامت سمجھ لیا گیا ہے۔ حالیہ ایک روزہ میچوں کے دوران میں ایک مقام پر ایک خاندان کے بہت سے افراد جمع تھے۔ دیندار گھرانہ پردہ دار دوشیزائیں، لیکن کرکٹ کی بیماری کا اثر ان پر بھی دیکھا۔ ایک محترمہ پوچھتی ہیں: ”آج کے میچ کا کیا بنا؟“ سب نے کچھ تا سفا بھرے لہجے میں بتایا کہ وہ خبریں ہمیں سن سکے۔ اس پر ان دیندار اور برقعہ پوش اور طالبات کی ایک دینی تنظیم سے وابستہ طالبہ نے تبصرہ فرمایا ”کیا تم سب اتنے بے ذوق ہو کہ کسی کو میچ کے زلٹ کی کوئی خبر نہیں؟“ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کرکٹ کا روگ کیسی کیسی رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔ ایک اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مذتِ اسلام کے بڑے دشمن اور بدخواہ ممالک میں سے کرکٹ کا کھیل روس میں ہے نہ امریکہ میں اور نہ اسرائیل میں۔ یہ انگریزوں کی عنایت ہم ذہنی غلاموں پر ہوتی اور ہم نے بڑی ممنونیت سے اس عنایت کو اپنی تہذیبی روایت بنا لیا ہے۔